اصلاحِ تعلیم کی تحریک میں شبلیؒ کا کردار

محمد نذیر کاکاخیل

"کسی چیز کی خرابی کا اثر عموماً ابتداء میں ظاہر نہیں ہوتا بلکہ یہ اثر پہلے پیدا ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ بڑھتا ہے یہاں تک کہ بالآخر علانیہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ موجودہ نصاب کی خرابی کا اثر پہلے ہی دن شروع ہو گیا تھا جس کی بدیہی دلیل یہ ہے کہ جس دن سے یہ نصاب جاری ہوا عین اس وقت سے علم کا تنزل شروع ہو گیا جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے"۔[1] یہ ہیں وہ تاثرات جو مولانا شبلیؒ نے "ندوۃ اور نصاب تعلیم" کے عنوان سے اپنے ایک مقالے میں قلمبند کئے۔ ندوۃ کے قائم کرنے کی سب سے بڑی ضرورت بقول شبلیؒ "نصابِ تعلیم کی اصلاح تھی"۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غیر منقسم ہندوستان میں نہ تو دینی مدارس کی کمی تھی اور نہ ہی بنگال کے مدارس اور "علی گڑھ تحریک" کی موجودگی میں کسی مزید جدید ادارے کی ضرورت تھی کیونکہ ایک طرف اگر خالص دینی تعلیم دی جاتی تھی تو دوسری طرف دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ طلباء کو جدید تعلیم کے زیور سے بھی آراستہ کیا جاتا تھا۔ قدیم مدارس کی مخالفت اور ان کی اصلاح کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے سید سلیمان ندویؒ کی اس رائے سے اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ "مولانا سے پہلے ہمارے علماء پر مدرسیت اتنی چھا گئی تھی کہ ان کی نظر درسی کتب اور ان کے شروح و حواشی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ زیر درس کتابوں کے علاوہ کسی نئی کتاب کا دیکھنا اور علم و فن کی کتاب سے استفادہ، قلمی کتابوں کی تلاش اور نوادر کتب کے مطالعہ کا شوق عموماً ناپید تھا"۔[2] اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ "علی گڑھ تحریک" سے ان کی

---

[1] مقالات شبلی (جلد اوّل) اعظم گڑھ ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء، صـ۱۲۶ و بعد

[2] سید سلیمان ندوی، حیات شبلیؒ۔ اعظم گڑھ ۱۳۲۶ھ/۱۹۴۳ء، صـ۳۶

مخالفت کیوں تھی جبکہ آغاز میں انھوں نے "علی گڑھ تحریک" کا ساتھ دیا تھا۔ اس کا جواب معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم مختصراً اس ماحول کا جائزہ لیں جس میں شبلی مرحوم نے پرورش پائی اور جہاں ان کے افکار پروان چڑھے۔

شبلی نعمانیؒ نے مروّجہ نظام کے تحت تعلیم حاصل کی۔ مختلف اندازِ فکر کے لوگوں سے انہیں واسطہ پڑا۔ دائرۂ احباب و اساتذہ بڑا وسیع تھا یہی وجہ تھی کہ ان کا ذہن محدود نہیں تھا اور وہ قوت فکری سے برے بھلے میں تمیز کے قائل ہو کر آغاز ہی میں فکری تنگ نظری کو خیر باد کہہ چکے تھے۔ چنانچہ جب انھوں نے سرسیّد کی علمی تحریک کا دور سے مطالعہ کیا تو انہیں اس میں بہت سے ایسے افکار نظر آئے جو ان کے اپنے تھے اور انہیں اس تحریک میں گویا اپنے افکار کو عملی جامہ پہنانے کی ایک کرن دکھائی دی۔ علی گڑھ پہنچ کر شبلیؒ اپنے اس خواب کی پوری تعبیر تو نہ دیکھ سکے البتہ انہیں وہاں یورپ کے افکار و علمی تحقیقات سے روشناسی کا موقع ضرور مل گیا۔ سب سے بڑھ کر جو فائدہ پہنچا وہ پروفیسر آرنلڈ (ARNOLD) جیسے انگریز عالم کی رفاقت تھی۔ پروفیسر آرنلڈ نے شبلیؒ کو جدید تحقیق کے رموز بتا دیئے اور شبلیؒ نے انہیں اپنے لئے رہنما اصول بنا لیا اور خود مولانا سے پروفیسر موصوف نے عربی میں استفادہ کیا[۳]۔ علی گڑھ تحریک کا دوسرا اثر ان پر یہ ہوا کہ انگریزی تعلیم کی ضرورت ان پر عیاں ہو گئی اور لوگوں کو اس پر آمادہ کرنے کے لئے کمربستہ ہو گئے۔ یہ تو تھا علی گڑھ میں ان کا مثبت پہلو۔ یعنی انھوں نے جدید علوم اور انگریزی زبان کی افادیت کو قبول کر لیا لیکن ساتھ ساتھ "علی گڑھ تحریک" کی کمزوریوں کا بھی قریب سے جائزہ لینے کا موقع مل گیا۔ اور جوں جوں وقت گزرتا رہا شبلی پر اس کی خامیاں آشکارا ہوتی رہیں۔ چنانچہ اپنے ایک عزیز کو لکھتے ہیں:۔

"یہاں آ کر میرے تمام خیالات مضبوط ہو گئے، معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے، مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی ترقی کا جوش برائے نام نہیں، یہاں ان چیزوں کا ذکر تک نہیں آتا بس خالی کوٹ پتلون کی نمائش گاہ ہے۔ ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھ کو بی۔اے کی نسبت یہ خیال دلاتے تھے

---

[۳] حیاتِ شبلیؒ۔ ص ۱۳۹-۴۰

کہ وہ مذہبی باتوں کو تمام تر ضعیف ثابت کر دیں گے۔ لاحول ولاقوۃ ..... وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی نہیں سمجھ سکتے ..... (سرسیّد) فرماتے ہیں کہ انگریزی ان کے دماغوں میں کچھ تبدیلی نہیں پیدا کرتی۔"[۴]

شبلیؒ کی اس شکایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے جدید طرزِ تعلیم کا جو خاکہ ان کے ذہن میں تھا وہ علی گڑھ میں چند نامعلوم دشواریوں کی بنا پر پورا ہوتا دکھائی نہ دیا۔ لہٰذا وہ جن امیدوں سے علی گڑھ گئے تھے اتنی ہی نامرادیاں لے کر واپس لوٹے اور بعد میں علی گڑھ تحریک کی عملی مخالفت کرنے لگے۔ شبلیؒ کے اس طرزِ عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں:-

"علی گڑھ کے پست علمی معیار سے مولانا شبلی کو جو شکایتیں تھیں ان سے ہم متفق ہیں لیکن انصاف کا تقاضا ہے کہ اس امر کا بھی اظہار کر دیا جائے کہ شبلی نے اس کے متعلق جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا اس سے اس کمی کی اصلاح ہرگز نہ ہو سکتی تھی۔ علی گڑھ کی اس کوتاہی کو دُور کرنے کا عملی طریقہ تو یہ تھا کہ شبلی اپنے قیام کے دوران اس کا سدّباب کرتے یا علی گڑھ سے آجانے کے بعد جب نواب محسن الملک انہیں بار بار بلاتے تھے اس وقت وہاں جا کر چند موزوں طلبہ کی علمی تربیت کرتے۔ شبلی سے یہ نہ ہوا صرف یہی نہیں بلکہ علی گڑھ کے متعلق ان کی شکایتیں بغور پڑھنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ان شکایتوں سے علی گڑھ کی اصلاح اس قدر مقصود نہ تھی جس قدر علی گڑھ کے مقابلے میں اپنے "ندوۃ" کی فوقیت دکھانا۔"[۵]

اکرام صاحب کی رائے اپنی جگہ درست لیکن جو کام شبلی علی گڑھ سے باہر کر سکتے تھے، وہ علی گڑھ کے اندر کبھی بھی سرانجام نہیں دے سکتے تھے چنانچہ آگے چل کر شبلی کے افکار نہ صرف علی گڑھ کے باہر کے لوگوں نے قبول کر لئے بلکہ بقول اکرام صاحب "(علی گڑھ) کے بعض بااثر طلباء نے (بھی) وہی خیالات اخذ کر لئے جو شبلی، ابوالکلام آزاد، سیّد سلیمان ندوی اور ان کے دوسرے رفقاء کے تھے اور سرسید کے خیالات کی عین ضد تھے"[۶] ظاہر ہے یہ تبدیلی محض اس وجہ سے آئی کہ علی گڑھ

---

[۴] مکاتیب شبلی (حصہ اوّل) مرتبہ سیّد سلیمان ندوی۔ اعظم گڑھ۔ بار دوم ۱۹۲۸ء۔ ص ۵۱-۵۰

[۵] شیخ محمد اکرام۔ موج کوثر۔ فیروز سنز (لاہور، پشاور، کراچی) بار دوم ۱۹۵۸ء ص ۵۵-۲۵۴۔ [۶] ایضاً ص ۲۷۷

کالج کو جس بلند مقصد کے حصول کے لئے ذریعہ بنایا گیا تھا وہ مقصد پورا نہ ہو سکا چنانچہ اسی مقصد کے حصول کے لئے شبلی کو علی گڑھ چھوڑ کر ندوہ کی بنیاد رکھنا پڑی۔

اتنا معلوم ہونے کے بعد کہ شبلی کو کیوں ایک الگ ادارے کی ضرورت محسوس ہوئی، اب ہم ان کی تعلیمی آراء سے بحث کریں گے، اور یہ دیکھیں گے کہ "ندوۃ" میں انھوں نے اپنے خیالات وآراء کو کس حد تک عملی جامہ پہنایا۔

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، شبلی جدید علوم اور انگریزی زبان کے دلدادہ تھے اور ان کا حصول مسلمانوں کے لئے لازم سمجھتے تھے کیونکہ بقول ان کے "تعلیم میں جب تک یورپ کی کسی زبان کی تعلیم لازمی نہ قرار دی جائے اور زمانہ موجودہ کے علوم وفنون نہ پڑھائے جائیں اس وقت تک مذاق حال کے موافق کیونکر اربابِ قلم پیدا ہو سکتے ہیں" [ے] شبلی کی طرح سر سیّد احمد خان بھی جدید علوم [⊕] کے حصول کے لئے رستہ ہموار کر رہے تھے لیکن دونوں کے طریقۂ کار اور مقصد میں بڑا فرق تھا۔ سر سیّد کا خیال یہ تھا کہ مسلمان مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز بن جائیں جبکہ شبلی کا مقصد یہ تھا کہ صحیح اسلامی عقائد واخلاق کی حفاظت اور بقاء کے ساتھ ساتھ نئے زمانہ کی صرف مفید باتوں کو قبول کیا جائے [ٹھ] بالفاظ دیگر ایک ترقی کی خاطر یورپ کی ہر قسم کی نقالی پر آمادہ تھے جبکہ دوسرے صرف مفید چیزوں کو اپنانا چاہتے تھے۔ شبلی کو ایک طرف اگر جدید تعلیم یافتہ طبقے کی مذہبی معلومات اور جدید علوم کے مرکز کے کردار پر افسوس تھا تو دوسری طرف انہیں قدیم مدارس کی خستہ حالی کا بھی فکر دامن گیر تھا چنانچہ اس وقت جبکہ آپ علی گڑھ ہی میں تھے، قدیم تعلیم پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے "سفر نامہ روم ومصر وشام" میں رقمطراز ہیں:۔

"آجکل .... تعلیم قدیم کی ابتری پر عموماً رنج اور افسوس کیا جاتا ہے لیکن میرا افسوس دوسری قسم کا افسوس تھا۔ ہمارے ملک کے نئے تعلیم یافتہ پرانی تعلیم پر رنج اور افسوس ظاہر کرتے ہیں وہ

ے مقالاتِ شبلی (جلد ہشتم) ص ۴۸

⊕ سر سیّد کے تعلیمی نظریات کے لئے ملاحظہ کیجئے ماہنامہ "فکر ونظر" بابت جنوری ۱۹۷۰ء

ٹھ حیاتِ شبلی ص ۲۹۰

درحقیقت رنج نہیں بلکہ استہزا اور شماتت ہے۔ میں اگرچہ نئی تعلیم کو پسند کرتا ہوں اور دل سے پسند کرتا ہوں تاہم پرانی تعلیم کا سخت حامی ہوں اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کی قومیت قائم رہنے کے لئے پرانی تعلیم ضروری اور سخت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ جب یہ دیکھتا ہوں کہ یہ تعلیم جس طریقہ سے جاری ہے وہ بالکل بے سود اور بے معنی ہے۔" [۹]

سرسیّد احمد خان کے آراء کے بالکل برخلاف شبلی نعمانی کا یہ خیال تھا کہ جدید تعلیم کا حصول اور انگریزی زبان کا سیکھنا اگرچہ لازم ہے لیکن یہ علوم اس انداز سے نہ ہوں کہ مسلمانوں کو اپنے علوم اور اپنے مذہب سے بے راہ رو کر دے۔ جہاں تک انگریزی زبان کا تعلق ہے تو اس کے سیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کا علم اس حد تک ہو کہ ایک عالم انگریزی زبان جان کر یورپ میں اسلام کی نشر و اشاعت کر سکے اور یہ کہ مستشرقین جو آئے دن کم علمی کی بنا پر یا دانستہ طور پر اسلام کے شعائر کو غلط انداز میں پیش کرتے رہے ہیں، ان کا رد لکھ کر اسلام اور اسلامی تعلیمات میں دلچسپی لینے والوں کے سامنے حقائق پیش کر سکیں۔ انگریزی تعلیم کی اس سے زیادہ ان کے ہاں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ کیونکہ بقول شبلی "انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں سے . . . . مذہبی خدمات یعنی امامت، وعظ اور افتاء کا کام لینا نہیں ہے۔" [۱۰] لیکن اگر انگریزی زبان اور جدید علوم ایک مسلمان عالم کو اس قابل نہ بنا سکیں کہ وہ کسی جدید زبان میں مذہب اسلام کی تعلیم و تلقین کر سکے تو ایسے سب علوم و فنون بے کار ہیں۔ شبلی ایک طرف اگر علوم جدیدہ کی مقصدیت پر زور دیتے ہیں اور رائج الوقت تعلیم میں، جو اس وقت مشرق کے بعض ممالک میں پروان چڑھ رہی تھی، خامیوں کی طرف اشارہ کرتے رہے، تو دوسری طرف انہوں نے قدیم پیشوایانِ دین کو بھی تنبیہ کر دی کہ وہ جدید علوم اور یورپی زبانوں کی بلاوجہ مخالفت ترک کر دیں جدید علوم کی مفید چیزوں کو اپنانے میں کوئی قباحت نہیں لیکن اگر ہمارے پیشوایانِ دین ان ضرورتوں کو رفع نہ کریں گے اور اب بھی یہ فتویٰ جاری رکھیں گے کہ ان (علوم و) زبانوں کا سیکھنا ناجائز ہے تو ان کو منصب مقتدائی چھوڑ دینا چاہیئے اور علیحدہ ہونا چاہیئے۔" [۱۱]

---

[۹] شبلی نعمانی۔ سفرنامہ روم و مصر و شام (اعظم گڑھ جولائی ۱۸۹۴ء) ص ۷۰

[۱۰] مقالاتِ شبلی (جلد اوّل) ص ۱۴۰ و بعد۔ [۱۱] ملاحظہ ہو شبلی کی وہ تقریر جو انھوں نے اجلاس لکھنؤ ۱۹۱۲ء میں کی تھی۔ روداد ندوۃ العلماء (اجلاس لکھنؤ ۱۹۱۲ء) ص ۳-۱۰۲

شبلی کے ہاں جدید علوم اور یورپ کی زبانوں کی اہمیت تو اپنی جگہ تھی لیکن مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کی اہمیت دوسری ساری چیزوں پر فوقیت رکھتی تھی۔ ترقی کی خاطر اگر مشرقی علوم اور عربی تعلیم کو قربان گاہ کی بھینٹ چڑھا دیا گیا" تو پھر مسلمان، مسلمان رہیں گے کہاں؟ جن کی ترقی کے لئے یہ جد و جہد ہو رہی ہے"۔[۱۲] آپ مولوی بشیر الدین صاحب کی اس رائے سے بالکل متفق نہیں تھے کہ "مجدد اعظم (سرسید) ..... انگریزی علوم و فنون کی تعلیم کو مسلمانوں کی تمام دینی اور دنیاوی ترقی کا وسیلہ سمجھتے تھے"۔ اور لکھتے ہیں کہ "کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ انگریزی علوم و فنون میں ملکہ حاصل کرنا اور مذہبی علوم اور عربی زبان سے بے بہرہ ہونا تمام دینی اور دنیاوی ترقی کا وسیلہ ہے۔ اگر یہی مطلب ہے تو یہ سرسید پر بہتان ہے۔ سرسید کی ہرگز یہ رائے نہیں تھی لیکن اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ عربی اور مذہبی تعلیم میں کامل ہونا تمام دنیوی اور دینی ترقی کا وسیلہ ہے تو بالکل درست ہے"۔[۱۳]

علی گڑھ سے مایوسی کے بعد مولانا شبلی نے "ندوۃ" کی تحریک کا آغاز بھی اس خیال سے کیا تھا کہ یہ قدیم و جدید کا ایسا سنگھم بنے جہاں دونوں دریاؤں کے دھارے آ کر ملیں۔ اور جہاں نہ صرف "دیوبند" کی کمی پوری ہو بلکہ علی گڑھ کے نصاب میں مذہبی تعلیم کی جو کمی ہے وہ بھی پوری ہو۔[۱۴] شبلی کے نزدیک نصاب تعلیم مرتب کرتے وقت یہ اصول پیش نظر رکھنے ضروری ہیں ورنہ پورا ڈھانچہ ہی گر کر تباہ ہونے کا اندیشہ ہے۔ وہ رہنما اصول یہ ہیں[۱۵]: (۱) تعلیم سے مقصود یہ ہے کہ نفس فن حاصل کیا جائے (۲) ہر فن کے حصول کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ اس فن کے مسائل کو منفرداً اور بہ استقلال حاصل کیا جائے تاکہ اس

---

۱۲ حیاتِ شبلی ص ۲۹۲ و بعد

۱۳ مقالاتِ شبلی (جلد ہشتم) مقالہ "البشیر اور ندوۃ العلماء" ص ۱۱۳ و بعد۔

۱۴ اس بات کی طرف اشارہ ان کے مضمون "ندوۃ العلماء کیا کر رہا ہے" میں موجود ہے جہاں انھوں نے لکھا ہے کہ ندوۃ العلماء کے یہ فرائض ہیں (۱) علماء میں ایثار نفس پیدا کرنا (۲) انگریزی دان علماء پیدا کرنا۔ (۳) مذاق حال کے موافق علماء کے گروہ میں مقررین اور ارباب قلم کا پیدا کرنا اور (۴) ایسے علماء کا پیدا کرنا جو غیر ممالک میں اسلام کی اشاعت کر سکیں۔ (تفصیلات کیلئے دیکھئے مقالاتِ شبلی (جلد ہشتم) ص ۶۷

۱۵ مقالاتِ شبلی (جلد اوّل) ص ۱۲۶ و بعد۔

فن کی طرف کافی توجہ ہو سکے۔ بجائے اس کے اگر چند فنون کے مسائل کو مخلوط کر کے حاصل کیا جائے گا تو کسی فن کی اچھی طرح تکمیل نہ ہو گی (۳) متعدد علوم و فنون کی تحصیل میں الاقدم فالاقدم کا خیال ضروری ہے یعنی یہ کہ جو فنون مقصود بالذات ہیں ان کے حاصل کرنے میں زیادہ وقت صرف کیا جائے جو مقصود بالعرض ہیں ان میں کم، اسی طرح علوم مقصود بالذات میں بھی بلحاظ اہمیت کے فرق مراتب کرنا چاہیئے یعنی جو علوم زیادہ مہتم بالشان اور ضروری ہیں وہ زیادہ توجہ کے قابل ہیں۔ (۴) ہر علم کی تحصیل میں سب سے مقدم یہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ اس فن کی جو غایت ہے وہ حاصل ہو۔

جن رہنما اصولوں کو شبلی نے بتایا ہے ان کی روشنی میں وہ جب ہندوستان میں مروجہ نصاب تعلیم کو دیکھتے ہیں تو اس میں "اکثر کتابیں ایسی ہیں جن میں نفس مسائل کے علاوہ نہایت کثرت سے لفظی مباحث ہوتے ہیں جن کا مدار کسی کتاب کے خاص الفاظ پر ہوتا ہے یعنی اگر اصل مسئلہ کو دوسرے الفاظ میں بیان کیا جائے تو وہ تمام مباحث بیکار ہو جاتے ہیں، جن میں متعدد فن مخلوط ہیں اس خلط مبحث کی وجہ سے طالب علم کا ذہن پریشان ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کونسا فن حاصل کر رہا ہے۔ بہت بڑی غلطی یہ ہے کہ جو علوم مقصود بالعرض ہیں ان کو مقصود بالذات بنا لیا گیا ہے اور زمانۂ تحصیل کا بڑا حصہ انہیں کے حاصل کرنے میں صرف کر دیا جاتا ہے۔"

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، ندوہ کے قائم کرنے کی سب سے بڑی ضرورت نصاب تعلیم کی اصلاح اور قدیم تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید علوم اور انگریزی زبان کا اجراء تھا۔ انگریزی زبان کے اجراء میں تو انہیں شروع شروع میں بڑی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن آخر کار ان کو کامیابی حاصل ہو گئی اور انگریزی زبان "ندوہ" میں رائج کر دی گئی۔ اب شبلی کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ انگریزی زبان کے ساتھ کس قدر مذہبی تعلیم ضروری ہے؟ چونکہ اس طبقہ سے امامت، وعظ و افتاء کا کام تو لینا نہیں تھا بلکہ اس طبقہ کے لوگوں کو اسلام کے ضروری مسائل سمجھانا اور تاریخ اسلام سے ضروری واقفیت پیدا کرنا تھا لہذا شبلی کے نزدیک یہ ضروری سمجھا گیا کہ ایسے لوگوں کے لئے ایک مختصر اور جامع سلسلہ کتب دینیات مرتب کیا جائے جس میں سکول سے کالج تک سلسلہ وار کتابیں ہوں جو تین قسم کی ہوں یعنی فقہ، عقائد اور تاریخ اسلام۔ فقہ و تاریخ کے لئے تو انھوں نے مصر میں چھپی ہوئی کتابوں کے ترجمہ پر اکتفا کیا البتہ عقائد کے بارے میں انہیں بھی مشکل پیش آئی کیونکہ مصر کی کتابوں کو انھوں نے ناکافی اور ناقابل تدریس

سمجھا۔ اور ہندوستانی کتابوں کو اس لئے مجوز نہ کر سکے کہ ابھی ان پر "تمام لوگوں کا اتفاق نہیں ہو سکتا" بہتر یہی سمجھا گیا کہ اسکولوں میں صرف فقہ اور تاریخ اسلام نیز سادہ عقائد کی تعلیم ہو اور کالج کی کلاسوں میں امام غزالی اور ابن رشد اور شاہ ولی اللہ صاحب کی چیدہ تصنیفات خود عربی زبان ہی میں پڑھائی جائیں۔ لیکن ایک بات جس پر شبلی بہت زور دیتے رہے وہ یہ تھی کہ کالجوں میں صرف کتابی تعلیم سے مذہبی اثر پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ طلباء کے چاروں طرف مذہبی عظمت کی تصویر نظر آئے۔

شبلی اگرچہ تعلیم میں اصلاح کی ضرورت پر زور دیتے تھے لیکن وہ ان مصلحین میں سے تھے جو آہستہ آہستہ اصلاح اور اس کے اچھے نتائج کے حق میں تھے۔ لیکن ان علماء کو جو کسی قسم کی اصلاح کی ضرورت خیال نہیں کرتے تھے، اصلاح پر مجبور نہیں کرتے تھے۔ یہاں ان کا استدلال یہ تھا کہ اگر ایک طرف مسلمانوں کو انگریزی زبان اور انگریزی علوم سکھا کر مغرب کے غیر مسلموں کے حملوں کی مدافعت اور اسلام کے پرچار کے لئے تیار کیا جائے تو دوسری طرف انگریزی نہ پڑھنے والوں کے کام بھی بہت بڑے ہیں:۔

"مذہبی کاموں کا دائرہ بہت وسیع ہے مثلاً دیہات کے جاہل مسلمانوں میں احکام اسلام کا پھیلانا اتنا بڑا وسیع کام ہے جس کے لئے سینکڑوں ہزاروں مولویوں اور واعظوں کی ضرورت ہے۔ اسی طرح مساجد کی امامت اور فتویٰ وغیرہ بہت سے کام ہیں جو محض خالص قدیم تعلیم یافتہ حضرات انجام دے سکتے ہیں اس لئے تقسیم عمل کی رو سے یہ کام اس گروہ کے ہاتھ میں دے دینے چاہئیں اور ہر طرح پر ان کی تائید و اعانت و احترام کرنا چاہیئے۔" [16]

ظاہر ہے کہ شبلیؒ اسلام کی سربلندی اور باہمی اخوت کے رشتوں کو مضبوط کرنے کے لئے دونوں گروہوں میں کوئی تفریق نہیں کرتے تھے خیال اگر تھا تو صرف اتنا کہ قدیم طرز پر تعلیم پانے والے لوگوں کی اس طرح تربیت ہو جس سے تعصب، سخت دلی اور تنگ خیالی

---

[16] مقالاتِ شبلی (جلد اوّل) ص ۱۴۳

پیدا نہ ہو اور جدید تعلیم یافتہ اور قدیم تعلیم یافتہ ایک ہی محفل میں بیٹھ کر ایک دوسرے کو اپنا حریف نہ سمجھیں۔

پورے ہندوستان کے نصابِ تعلیم کو ایک سطح پر لانے کے لئے اور علماء کے باہمی نزاع و تفریق کو ختم کرنے کے لئے شبلی نے ندوۃ العلماء کے تیسرے جلسے (منعقدہ ۲۴ر اپریل ۱۸۹۴ء) سے دیگر تجاویز کے علاوہ یہ تجویز بھی پاس کرائی کہ مدارس اسلامیہ کے مہتمم یا ان کے نمائندے ہر سال ندوۃ العلماء میں شریک ہوں اور یہ کہ مدارس اسلامیہ کو آپس میں مربوط کرنے کے لئے دیوبند، مدرسۂ فیض عام کانپور، مدرسۂ احمدیہ وغیرہ کو دارالعلوم کی حیثیت دی جائے اور دوسرے چھوٹے مدارس کو ان کی شاخیں قرار دے کر انہیں دارالعلوم کی نگرانی میں دیا جائے۔[۱۷]

شبلی نے "ندوۃ" سے جو امیدیں وابستہ کی تھیں اور وہ اس سے جو کام لینا چاہتے تھے، انہیں شائد اس میں کامیابی ہو جاتی لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔ دوسری طرف ان کے جانشین ان کی اصلاحی روح کو آگے بڑھانے میں وہ توازن و اہتمام باقی نہ رکھ سکے جو ان کی خصوصیت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ندوۃ جو علی گڑھ کی خامیوں کی اصلاح کے ساتھ قدیم و جدید کا حسین امتزاج پیدا کرنا چاہتا تھا، اپنے راستہ سے ہٹ کر محض قدامت کا علمبردار بن کر رہ گیا۔

---

[۱۷] حیاتِ شبلی ص ۸ - ۳۰۷